داغ

سمیرا حمید

گرمیوں کے دن تھے اور وہ پچھواڑے جانے کے بجائے اوپر چھت پر آگئی۔ چھت کے بنیرے نہیں تھے۔ چارپائی پر بیٹھتے ہی اس نے دور تک پھیلے ہوئے پچھواڑے میں لگے لسوڑے کے درخت کے پاس مچلتی ہوئی سدرہ کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہی۔

سات دن ہوئے تھے اس کی شادی ہوئے اور اس کا شوہر آج ہی اسے لے کر اس کے میکے آیا تھا۔ درخت کے پاس اٹھکیلیاں کرتے وہ دونوں نہ جانے کون کون سی کہانیاں سنا رہے تھے۔ وسیع پچھواڑے کو عبور کرتی سدرہ کی ہنسی کی ہلکی سی آواز اسے چھت پر بھی سنائی دے رہی تھی۔ صدیق لسوڑے کے درخت پر چڑھنے کی کوشش کرتا اور سدرہ نیچے سے اس کی ٹانگ کھینچ دیتی اور پھر ہنستی ہی چلی جاتی نئی نئی شادی میں ہنسی بلاوجہ ہی آتی ہے۔

گھومتی ہوئی دنیا میں اسے جیسے صرف سدرہ ہی نظر آرہی تھی۔

اچانک سدرہ کی نظر اوپر چھت پر اس پر پڑی سدرہ کی ہنسی کم ہوتے ہوئے تھم گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر صدیق کی ٹانگ کھینچتی۔ وہ اوپر چڑھتے چڑھتے خود ہی ایک دم سے نیچے آگرا اور اتنی زور سے گرا کہ اندرونی کمروں سے بھابھی اور دوسرے لوگ بھاگتے ہوئے اس کی طرف آگئے۔ چھت سے بھاگتی ہوئی وہ بھی اس کی طرف لپکی۔

سدرہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "تو رہن دے مائی!"

بھابھی اور گھر کے دوسرے افراد نے کچھ غصے اور کچھ خوف سے سدرہ کو گھور کر دیکھا جیسے وہ ہر بار اسے گھورا کرتے تھے لیکن اس کے چہرے پر وہی تاثر رہا۔ اس کی آنکھوں اور انداز میں غصہ اور نفرت صاف دکھائی دے رہے تھے۔ صدیق کراہ رہا تھا اور سدرہ کی آنکھوں سے آنسو باہر آنے کو تھے۔

سدرہ کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اسے اچھی نہیں لگی۔ غصہ وہ اکثر اس پر اتار لیا کرتی تھی۔ اپنے کپڑوں کے پھٹ جانے، جل جانے، گم ہو جانے کہ بے ڈھنگا سلنے پر بھی، کھیر میں چینی کم ہو جانے، بازار سے چیزیں ٹھیک نہ ملنے، صندوق میں کپڑے پڑ جانے اور اپنے پراندے کی بے ڈھنگی گرہ پر بھی تلملاتی ہوئی اسی کے پاس آتی۔۔۔۔ وہ سو بھی رہی ہوتی تو اس کا لحاف اٹھا کر اسے جلی کٹی سناتی۔ کبھی چلا چلا کر اور کبھی رو رو کر اپنا غصہ نکالتی۔

"تو چاہتی ہی نہیں تھی کہ میں رخسانہ کی شادی میں جاؤں۔ یہ دیکھ! میرے کپڑے جلے تو جلے میرا ایک بھی سوچ کیا لنگڑی ہو گئی ہوں میں۔ اب خوش ہے، پڑ گئی ٹھنڈ؟ لڑکیوں کی شادی کی خبر سنتے ہی تو آگ لگ جاتی ہے نا۔ اچھا کیا رخسانہ کی اماں نے تجھے نہیں بلایا تو تو اس کے باراتی بھی نگل جاتی۔ جل جاتے ہوں جاتے لے مر۔ اب میں نہیں جاؤں اس کی شادی میں تیرے ساتھ مل کر بین ڈالوں گی۔

کتنی چھپ چھپ کر تیاریاں کی تھیں لیکن پھر بھی ایک کپڑا نہ بچا اور جوتیوں کے لیے پہلے پیسے کم ہوئے اب پاؤں جل گیا۔ اگر ابھی بھی میں نے جانے کا خیال دل سے نہ نکالا تو یا میں جل کر مر جاؤں گی یا میرا منہ تیری منہ کی طرح جلا ہوا نہ ہو جائے گا۔ کہیں جانے کے قابل ہی نہ رہے گا۔ اللہ جانے تجھے کب ٹھنڈ پڑے گی۔ بہت سوں کے ارمان تو راکھ کر دیے۔"

"مائی! تو ہماری جان کب چھوڑے گی۔" ہر لڑائی کا اختتام اسی ایک جملے پر ہوتا۔ جان چھوڑنے سے اس کا مطلب مر جانا قطعی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن صدیق کے گرنے پر اس نے کچھ نہیں کیا۔ رات کو وہ اس کے پاس آگئی۔

"میں جا رہی ہوں مائی!" اس نے ایسے کہا جیسے بہت ضبط سے بول رہی ہو۔

"مرا نہیں، جو تو دیکھنے آئی تھی؟"

"یہ کہہ رہے ہیں گھر چلتے ہیں پھر کبھی آجائیں گے۔" وہ اٹھتے اٹھتے رک گئی۔ "کہا سنا معاف کرنا۔"

"رو جانا۔" مائی کی آواز لرزنے لگی۔

"رونا کس کو؟ پھر بھی۔" اس نے ایسے کہا جیسے کہا ہو "ہونہہ۔"

"یہ لے۔" اس نے دوپٹے کی گرہ کھول کر ایک پچاس اور ایک بیس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ مائی پلنگ سے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما اور کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس کا ماتھا چوما۔۔۔

"رہن دے مائی! یہ لاڈ پیار ہمیں راس نہیں آتے تیرے۔ ہمیں تو تیری ساڑ ہی راس ہے۔"

ضبط کرتے کرتے بھی وہ کہہ ہی گئی۔ مائی کے ادھ جلے چہرے پر سیاہ رنگ آکر گزرنے لگے۔

جب وہ جوان تھی تو وہ سدرہ کے باپ کو کھلایا کرتی تھی۔ وہ اس کا سب سے چھوٹا بھائی تھا اور سدرہ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ ورنہ بڑے بھائیوں کے تو پوتوں کے بچے بھی جوان ہونے کو تھے۔ گھر بھرا ہوا تھا بھائیوں کی اولادوں کی اولادوں سے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ مائی کو کچھ کہہ جائے۔ کچھ ڈرتے تھے، کچھ احترام کرتے تھے، کچھ محبت اور بہت سارے ہمدردی۔

ایک سدرہ تھی جو کم ہی لحاظ کرتی تھی۔ وہ ان پچاس پچاس لوگوں میں سے شاید اکیلی تھی جس نے مڑ کر مائی کو خود، خود ہی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

جہاں دوسروں کو "چپ! تمہیں نہیں پتا" کہہ کر خاموش کروایا جاتا تھا، وہاں سدرہ "جانتی ہوں میں اس [illegible] کو" کہہ کر سب کو خاموش کروا دیا کرتی تھی۔

وہ اندر ہی اندر اس سے خار نہیں کھاتی تھی بلکہ دکھاتی بھی تھی۔ وہ اس سے محبت بھی کرتی تھی اور نفرت بھی۔ وہ اس کی اکلوتی پھوپھی تھی اور اسے پیاری تھی جیسی کہ عموماً "پھوپھیاں" ہوتی ہیں۔

"مائی روئی ہوگی بہت؟" ہر نئے جوان ہونے والوں کی طرح اس نے بھی یہ سوال سب سے اور بہت بار پوچھا۔ بتانے والے کی شکل بتا دیتی کہ مائی کتنا روئی ہوگی۔

"تو نہیں ترس نہیں آیا؟"

"بہت محبت کرتی ہوگی۔"

"کیا ابھی بھی کرتی ہے؟ یاد تو آتا ہوگا؟"

"اچھا تو پھر بہت نفرت کرنے لگی ہوگی اس سے۔ اسی لیے ایسی ہو گئی ہے۔"

"ہائے یہ اپنی مائی ہے۔ اپنی دمڑی۔۔۔"

وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر نہ صرف اس نے خود دیکھی بلکہ گھوم پھر کر ہر اس شخص کو دکھائی جو مائی سے خار کھاتا تھا۔

"مائی اتنی خوبصورت تھی؟" دیکھنے والے تصویر پکڑے رشک میں جلا ہو جاتے کچھ تصویر ہاتھ میں چھپا کر ایک نظر مائی کو اور ایک نظر تصویر کو دیکھے جاتے اور حیران ہوتے جاتے۔ "یہ مائی ہے؟"

وہ مائی ہی تھی جہاں دوسروں میں کبھی غصہ، کبھی نفرت، کبھی لڑائی تھی، جہاں وہ سب کے سب خوشی، ضرورت، بلحاظ احترام، پیار اور ابہام سے بھرے پڑے تھے، وہاں مائی میں ایک ہی چیز بہت تھی، وہ کرب، بہت تھی اور بہت زیادہ تھی، وہ کالی زبان والی تھی۔ وہ بیٹھے، کھڑے، لیٹے، سونے سے جاگتے، خوشی، مرگ، اندر، باہر کسی بھی وقت شروع ہو جاتی تھی۔ پہلے وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی، کبھی لمحوں کے لیے، کبھی گھنٹوں کے لیے، اس کی آنکھیں سرخ ہو کر ضبط سے باہر آنے کو ہوتیں، اس کا ادھ جلا منہ اور سیاہ ہو جاتا اور اس کا وجود پھنکارنے لگتا۔۔۔

جیسے ایک بار دھوپ سینکتے ہوئے وہ سب مالٹے کھا رہے تھے۔ لمانت مشین کا ہینڈل گھما گھما کر مالٹے کا جوس نکال رہا تھا۔ کالی مرچ چھڑک کر وہ باری باری سب کو گلاس بھر بھر دے رہا تھا۔ مائی گھٹنے سے مشین کے ہینڈل کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھیں گھما رہی تھی، ایک طرف رخ کیے جیسے وہ سب سے بے نیاز تھی۔

"تو مر جائے شمیم اختر۔۔۔"

اس کا رخ اپنی بڑی بھابھی کی طرف تھا جو گندم صاف کر رہی تھی۔

"لولی لنگڑی ہو جائے، بیوہ ہو جائے، تیرا منہ کالا ہو جائے، تیری قبر میں کیڑے پڑیں۔ تیرے جنازے کے پیچھے کتے روئیں، تیری شکل پر پھٹکار پڑے، لعنت ہو تجھ پر، چیل کوے تیرا مردار کھائیں۔ تیری۔۔۔"

سانس لیے بغیر وہ بکتی ہی چلی گئی۔ سب منہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔ ساگ کاٹتے کاٹتے منجھلی بھابھی کی بہو، جس کی شادی کو ایک مہینہ ہی ہوا تھا، اپنی انگلی کاٹ بیٹھی۔ بڑی بھابھی کی دو بہوئیں، جو ہاتھ سے گندم صاف کر رہی تھیں، ہاتھ روک کر تشویش سے اپنی ساس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"دمڑیے! خدا کا خوف کر۔۔۔" وہ چھاج پھینک کر لپک کر اس کے پاس آئی اور اسے بری طرح جھنجھوڑا۔ یہ سوال تو اب پرانا ہو چکا تھا کہ "میں نے کیا کیا" یا "میں نے کیا کہا۔"

وہ دمڑی تھی۔ وہ کسی وقت بھی کسی پر بھی شروع ہو جاتی تھی، ایک دم سے ابل پڑتی تھی۔

شمیم اختر اس کے سر پر کھڑی اسے جھنجھوڑتی رہی لیکن اس کی زبان نہیں رکی۔ دھوپ سینکتے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ دمڑی بددعاؤں پر بددعائیں دیے جا رہی تھی اور کوئی اسے خاموش نہیں کروا سکا تھا۔ اتنے سالوں میں کہاں کوئی کروا سکا تھا۔

رات سوتے ہوئے شمیم اختر کے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ اسے ایمرجنسی میں اسپتال لے جانا پڑا۔ وہاں ان کے پتے کا، جو پھٹنے ہی والا تھا، آپریشن ہوا۔ اسپتال میں دمڑی ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ چار دن تک آنکھ جھپکے بغیر وہ ان کی خدمت کرتی رہی۔

"اب تو خوش اے دمڑیے!" تیسرے دن انہوں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ "تو ہماری بچی ہی نہیں۔" شمیم اختر نے اپنے آنسو صاف کیے۔ "تیرے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کے بھی تھک گئے ہم۔"

دمڑی انہیں آنسو صاف کرتے دیکھے جا رہی تھی۔ ایسی باتیں سنتے ہوئے وہ مردوں کی طرح ہو جاتی تھی۔

مہینہ بھر پہلے بھی وہ ایسے ہی ہو گئی تھی جب چار سال کی منزہ کو گھورے جا رہی تھی اور گندی گندی گالیاں اور بددعائیں دے رہی تھی۔ بھابھی اس کے منہ پر رگڑ رگڑ کر صابن لگا رہی تھیں، صابن لگے ہاتھوں سے ہی وہ بھاگ کر اس کے پاس آئی اور ہاتھ جوڑ کر رونے لگی۔

"نہ میری بہن۔۔۔ نہ۔۔۔ اس بچی کا کیا قصور ہے، نہ دمڑیے! خدا کا واسطہ ایسا نہ بول۔"

پر وہ بولتی ہی چلی گئی۔ صابن آنکھوں میں جانے سے منزہ زور زور سے رونے لگی۔ پر بھابھی پھر بھی دمڑی کو ہی چپ کروانے کی کوششیں کرتی رہیں۔ منزہ کی ماں اندر سے گرتی پڑتی آئی۔ دو دن پہلے ہی اس کے گھر بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ منزہ تک آئی اور اس پر پانی ڈالنے لگی۔

کمزوری اور نقاہت سے وہ خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی منزہ پر اس زور سے گری کہ منزہ اس کے نیچے دب

گئی۔ اس کا منہ کھرے کی نالی سے اس زور سے لگا کہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے اور منہ خون سے بھر گیا۔ ماتھے پر ایک کٹ پڑ گیا اور آنکھ کی ہڈی پر اتنا شدید درد ہوا کہ وہ سانس لینا اور رونا بھول گئی۔

سب سے پہلے دمڑی منزہ کے پاس پہنچی اور لپک کر سینے سے لگایا۔

وہ دمڑی تھی۔ سب اس سے عاجز اور بے زار تھے لیکن وہ کیا کرتے، وہ ان کی بالی تھی۔ جب نئی نئی سدرہ کی ماں بیاہ کر آئی تو وہ اس سے بہت خار کھاتی تھی تب وہ صرف دمڑی تھی، مائی نہیں تھی۔

اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ شروع دنوں کی چڑ اور خار وقت کے ساتھ ساتھ پیار اور ہمدردی میں بدلنے لگی کیونکہ وہ اتنی ہی بے ضرر تھی جتنی کہ ایسی عورتیں ہوتی ہیں، جنہوں نے شادی نہ کی ہو اور جو وقت سے پہلے ہی بوڑھی لگنے لگی ہوں۔

جیسے جیسے وہ بھائی اور بھابھیاں اس کا خیال رکھتے تھے، وہ بھی رکھنے لگی۔ اس دن دمڑی باورچی خانے میں مٹی کے چولہے کے پاس بے وجہ بیٹھی تھی۔ کھانا کب کا کھایا جا چکا تھا، دودھ بھی ابال لیا تھا۔ لکڑی کے تخت کوئلے ابھی بھی گرم تھے، جنہیں وہ کبھی تنکوں سے اور کبھی ہاتھ سے کرید رہی تھی۔ ان میں سے جو ہلکی ہلکی چنگاری اٹھ رہی تھی، وہ اس کی آنکھوں میں دکھائی دے رہی تھی۔ کافی دیر سے وہ یہی کچھ کر رہی تھی۔

عشاء کی نماز پڑھ کر سب اپنے اپنے کمروں میں بند ہو چکے تھے۔ صرف راحت تھی، جو صحن میں ٹہل ٹہل کر اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ باورچی خانے کے کھلے اور کھلے دروازے سے دمڑی کبھی کبھی آنکھ اٹھا کر اسے بھی دیکھ لیتی تھی۔ راحت کا پیٹ بڑھا ہوا تھا، اس کے پیٹ پر نظر پڑتے ہی دمڑی کی آنکھوں کی چنگاری جاگ اٹھی اور کچھ آنسو نکل کر جلتے بجھتے کوئلوں پر گرے۔

"دمڑیے! سونا نہیں ہے، اتنی ٹھنڈ ہے، کیوں بیٹھی ہے یہاں۔۔۔" راحت اپنے شوہر کے لیے کھانا گرم کرنے آئی تھی۔ اس کی آواز، اس کی چال، اس کا انداز سب کچھ دلربا تھا۔ دمڑی نے آنکھ بھر کر اسے دیکھا۔ اس کی ایک ایک ادا کو جانچا جیسے اس کی شرم و حیا اور مسرت کے ذائقے کو چکھنا چاہتی ہو۔ راحت نے اس کی طرف دیکھا اور ڈر گئی۔

"کیا ہوا ہے، ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

"تیرا پیٹ مردہ ہو جائے۔۔۔"

یہ وہ آخری الفاظ تھے جو آگ کی طرح راحت کے کانوں میں پڑے۔ دمڑی ساتھ ساتھ گرم کوئلے اس پر اچھال رہی تھی۔ راحت منہ کھولے اسے دیکھنے لگی۔ وہ وحشی لگ رہی تھی۔ دمڑی کا یہ روپ دیکھ کر اس کے جیسے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ اس نے پہلے صرف سنا ہی تھا۔

سات ماہ کے بچے کو جنم دے کر وہ کئی دن تک روتی رہی اور جس دن بچہ اٹھا، جس دن کا ہو کر مر گیا، اس دن اس نے بھی دمڑی کے ہی انداز میں اسے بددعائیں دیں۔ اس نے اپنی جھولی پھیلائی اور اسے کوسنے لگی۔

"تیرا ککھ نہ رہے دمڑیے!"

"اس کے پاس ہے ہی کیا جو ککھ ہوگی وہ۔۔۔" بڑی بھابھی نے آہ بھری۔

وہ چھوٹی تھی۔ پہلا بچہ تھا۔ غم سہہ نہ سکی۔ نہ وہ اسے معاف کر سکتی تھی نہ بھول سکتی تھی۔ دمڑی کی شکل دیکھتے ہی اسے کوسنے دینے لگتی، پھر جھر جھر رونے لگتی۔

کئی سال ایسی کشمکش میں گزر گئے کہ یا اس گھر میں دمڑی رہے گی یا وہ۔ وہ ناراض ہو کر میکے گئی۔ کئی عیدیں گزر گئیں مگر وہ نہیں آئی۔ اس کا بھائی سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ کبھی دمڑی کے آگے رو لیتا، کبھی اس کی منت کرتا۔ کبھی صبر کر جاتا، کبھی بے صبرا ہو کر باؤلا ہو جاتا۔

آخر دمڑی ہی راحت کو لے کر آئی۔ دونوں میں کیا بات ہوئی، کوئی نہیں جانتا تھا لیکن نہ صرف راحت واپس آگئی تھی بلکہ پہلے ہی کی طرح دمڑیے کا خیال رکھنے لگی تھی۔

آنے والے ہر دن، ہر سر کے ساتھ وہ دمڑی بنتی گئی۔ بہت سوں کو اس کی زبان کی کاٹ سہنی پڑی۔ کوئی چھوٹا، بڑا، اپنا، غیر، رشتے دار، پڑوسی، ملنے جلنے والا، سلام دعا والا، پھیری والا، سبزی والا، گیس والا، رکشے والا ایسا نہیں تھا، جو اتنے سالوں میں اس کی زبان کی زد میں نہ آیا ہو۔ لوگوں کے لیے اس کی ادھ جلی شکل سے زیادہ اس کی زبان بد صورت تھی۔

عام دنوں میں وہ اپنے آپ میں گم رہتی، اپنے کام سے کام رکھتی، رضائیوں گدوں میں ٹکندے ڈالنے پر آتی تو سردیوں سے گرمیاں آجاتیں اور ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گھر تک آتے آتے موسم بدل جاتے۔ کسی کی چارپائی کی بنائی، کبھی گندم صاف کرنا اور کبھی گندم کے بڑے بڑے ڈرم دھوپ میں دھو دھو کر چکائی، کوئی ساگ کاٹنے کو دے جاتا اور کوئی بے کار پرانے اونی سوئیٹروں کے گولے بنانے کو دے جاتا۔ کام کوئی سا بھی ہوتا۔ وہ انکار نہیں کرتی تھی حتیٰ کہ ایک بار سدرہ نے اسے چھتوں پر دھاگا لپیٹنا سکھا کر رات دن اس سے جھلے بنوائے۔

سب کچھ ٹھیک تھا کہیں خرابی تھی تو اس کی ہولناک زبان میں۔ جب جب اس کی زبان کی زد میں کوئی آتا، اس پر موقع پر سب کا جی چاہتا کہ دمڑی کا گلا ہی دبا دے۔

"منحوس، کالی زبان والی۔"

پھر اس کی تاریخ کھنگالی جاتی

اس کا ماضی دہرایا جاتا کہ کیوں، کب اور کیسے۔۔۔

بڑی دو بھابھیاں سسکیاں بھرتیں۔ ان کی اولاد جیسی بھی دمڑی، اور ان کی اولاد یا اولاد کی اولاد اسے برا بھلا کہتے تو ان سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

"مائی ایسے کیوں کرتی ہے؟" نوید نے بری طرح پاؤں پٹخے۔

"شادی ہی کر دیتے مائی کی۔" قدسیہ نے فرخندہ کے کان میں گھس کر کہا۔

"وہ مردوں سے نفرت کرتی ہوگی۔" فرخندہ نے بھی سرگوشی ہی کی۔

"اگر مردوں سے نفرت کرتی تو گھنٹہ گھنٹہ گھر کے مردوں کے سروں میں مالش نہ کرتی۔"

"ایسی شکل والی سے کون شادی کرتا۔"

"ہاں بتا تو رہی تھی ایک دن کہ مسجد کے مولوی صاحب جو حافظ بھی تھے۔ کتنا اصرار کرتے رہے تھے۔"

"مائی کو مولوی پسند نہیں ہوں گے۔" فرخندہ نے بری سی شکل بنا کر کہا۔

وہ سب کمرے میں ٹولیاں بنائے ایک دوسرے سے لیکن ایک ہی سوچ رہے تھے۔ مائی کے سب کے پاس کوئی نہ کوئی قصہ ہوتا سنانے کے لیے۔ کوئی بھاگاں کی ڈولی دلہن کے پاؤں کے جل جانے کا قصہ سناتا تو کوئی دولہا نے احمد کی آنکھ کے پھوٹ جانے کا۔ کوئی نالے میں گر گیا تو کسی کی چھت گر گئی۔

"اس کی نظر کھا جاتی ہے۔" وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے۔۔۔

"خود تو ہے ہی دمڑی، دوسروں کو بھی بنا کر چھوڑے گی۔"

وہ سب اس کے کام بھول جاتے۔ اس کی خدمت سالوں پر پھیلی اس کی خاموشی۔ یاد رکھتے تو وہ بددعائیں جو دمڑی جھولی پھیلا پھیلا کر انہیں دیتی۔ وہ کوکھیں اجاڑ دیتی، وجود جلا دیتی۔ وہ عورت تھی لیکن اس کا دل ڈائن کا تھا۔

خاندان کے وہ سب بڑے جن کے سامنے وہ پل کر جوان ہوئی تھی، اسے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتے۔

انہیں اس کی کم بخت دعاؤں پر حیرت ہوتی تھی نہ افسوس۔ اور وہ لوگ جو اسے ڈھلتی عمر سے جانتے تھے، اس سے ڈرتے بھی تھے، خوف زدہ بھی تھے اور اس کے ہمدرد بھی تھے۔

خاندان میں، پاس پڑوس میں ہونے والی شادیوں میں اسے خاص طور پر بلایا جاتا۔ ویسے بھی لوگ ڈرتے تھے کہ اگر دمڑی کو نہ بلایا تو کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ اس کے لیے خاص طور پر کپڑے بنوائے جاتے۔ شادی کی رسمات میں تو خیر دمڑی کبھی بھی

شرکت نہیں کرتی تھی۔ سارا وقت شادی والے گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔ یا الگ کسی کونے میں پڑی رہتی۔

لڑکے کی شادی میں اسے کوئی نہ کوئی سونے کی چیز بنا کر دی جاتی چاہے وہ باریک لونگ ہی کیوں نہ ہوتی۔ کئی انگوٹھیاں، جھمکیاں اسے ملیں مگر کسی نے ایک بار بھی اسے پہنے نہیں دیکھا۔ ملنے والی چیزوں کو وہ ایک دوسری نظر بھی نہیں دیکھتی تھی۔

اپنے بچے سنبھالنے کو اس کے حوالے اس کے کمرے میں سلا جاتے۔ وہ اکثر انہیں اٹھ اٹھ کر دودھ گرم کر کے دیتی۔ ایک رات جب سب اپنے اپنے کمروں میں دبکے پڑے تھے کہ اس کی چیخوں سے سہم کر اٹھ گئے۔ مائی کے کمرے میں سوئے چھوٹے بڑے بچے الگ رو رہے تھے۔۔۔

سب کے سب مائی کے کمرے کی طرف بھاگے۔ یہ ویسی ہی چیخیں تھیں جو اس سے پہلے سب نے اس کے بلبلانے سنی تھیں۔ بھائیوں، بھابھیوں کی بانہوں میں وہ بے جھول گئی۔ جیسے دل پھٹا جا رہا ہو۔ اپنا منہ کھرچ کھرچ کر اس نے لہولہان کر لیا تھا۔ شام کے ہی قصے تھا اس کا بڑا بھائی جن سوچ سے مرتے مرتے بچا تھا جب لکڑیوں سے کھینچ کر انہیں زمین پر لٹایا گیا تو اسے لگا جیسے دفنانے کے لیے میت کو لٹایا ہو۔ پل کے لیے۔ اسی بھائی نے اس کا کھردرا منہ چومنا شروع کر دیا۔

مائی کی ان دہلا دینے والی چیخوں اور حالت کے بعد کبھی کوئی بچہ اس کے کمرے میں نہیں سویا۔ ماؤں نے جب انہیں جلدی سلانا ہوتا تو وہ کہتیں۔ "سو جاؤ ورنہ مائی کے کمرے میں سلا دوں گی۔" اور بچے جھٹ سے سو جاتے۔

"کیسی عورت تھی دمڑی اور کیسی ہو گئی۔"

☆ ☆ ☆

وہ اپنے پھوپھی زاد کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ باقی گھر والوں میں سے صرف بڑے بھائی اور بھابھی ہی آئے تھے۔ وہ آنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی طبیعت کچھ مکدر سی تھی لیکن اسے بلانے والوں نے اتنا اور اس طرح اصرار کیا کہ اسے آنا ہی پڑا۔ احاطے سے ڈھولکی بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عورتیں ہنس بھی رہی تھیں اور گا بھی رہی تھیں۔ نہ جانے ایسے موقعوں پر انہیں اتنی شرارتیں کیسے سوجھتی ہیں کہ ہنسی کے فوارے ہی بند نہیں ہوتے۔ کوئی نہ کوئی چٹکلہ چھوڑ دیتا اور وہ گانا چھوڑ کر ہنستی رہتیں۔ بچے بھی شور کر رہے تھے اور مردانہ بھنبھناہٹ بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔

مائی کی چچا زاد، پھوپھی زاد، تایا زاد جو اس کی ہم عمر تھیں، بنی ٹھنی بیٹھی بنے پر چہکار رہی تھیں۔ بیٹوں اور شوہروں کی کمائی سے بنے زیورات سے لدی پڑی تھیں۔ اپنی عمروں کا روپ ان سب کے پاس تھا۔ وہ سب کی سب لڑکیاں بالیاں بنی ڈھولکی ایسے بجا رہی تھیں جیسے کچھ دن بعد ہی ان کی بھی شادی ہو۔ دور چوکی پر بیٹھی مائی بے خیالی میں انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ اسے ان کے گانوں یا ڈھولکی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جب ان کے فضول ہنسی مذاق ضرورت سے زیادہ بڑھ گئے تو وہ اٹھ کر سب سے کونے والے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ یہاں ان سب کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ ان سب میں سبز رنگ کا سوٹ پہنے ایک عورت سب سے زیادہ دلربا لگ رہی تھی۔ وہ کون تھی دمڑی نہیں جانتی تھی۔ آج پہلی بار ہی دمڑی نے اسے دیکھا تھا لیکن وہ جو کوئی بھی تھی۔ اس کی اداؤں پر سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ ایسے ہی جیسے کسی کو نئی نئی محبت ہو گئی ہو۔ ایسے ہی جیسے کبھی دمڑی ہوا کرتی تھی۔

کمرے میں آکر اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ ادھ جلے چہرے سے ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ وہ لحاف میں دبک گئی۔ کچھ دیر میں ہی اس کا وجود کانپنے لگا۔ بخار تو نہیں تھا اسے لیکن وہ بے حال سے بے حال ہو گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سبز سوٹ والی گھومنے لگی۔ وہ لپک لپک کر

ڈھولکی بجا رہی تھی اور مہندی لگے ہاتھوں سے اپنی ہنسی روک رہی تھی۔ وہ دمڑی کی ہم عمر ہو گی لیکن وہ ملی نہیں تھی۔

اسے کمرے میں کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی۔ لحاف سے اس نے اپنا اور اماں باہر نکال کر دیکھا۔

وہ گھوڑا بوسکی پر ویسٹ کوٹ پہنے وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"سفینہ!" کمرے میں اس سے نظریں ملتے ہی حیرت زدہ آواز گونجی۔

"سفینہ!" یہ نام اس نے اتنی صدیوں بعد سنا کہ اسے لگا کسی اور کو پکارا ہے۔

سفینہ تو وہ تب تھی جب وہ اس کا انتظار کر رہی تھی اور تب جب وہ ایک ہی تھی کی پوری۔ ادھ جلی نہیں تھی۔

وہ اسے دیکھتا ہی رہا۔

وہ اس کا تایا زاد تھا یوسف۔ بچپن سے وہ ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے ایک ہی گھر میں پھر ان کے گھر دور ہو گئے لیکن ان کے دل ایک ہی تھے

خاندان کی تقریبات میں وہ اس سے کنارا کرتی تھی۔ بڑے ناراض جو ہوتے تھے۔ وہ دونوں دوبار کے رشتے دار کی شادی میں لازمی شرکت کرتے تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مل سکیں۔

ان دنوں وہ سفینہ تھی۔ دودھ جیسی سفید' بڑی بڑی سیاہ آنکھیں لیے وہ خود کو شیشے میں یوسف کی نظروں سے' اس کے مستطے بار بار دیکھتی تھی۔ وہ اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا تھا اور اسے اپنا یہ حسن اسی کے لیے بھاتا تھا۔

ان دونوں کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں آتے ہی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ جلتی بجھتی آگ کو پھونکیں مار مار کر جلا رہی تھی اس کا سر نیچے زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا جب منجھلا بھائی مٹی کے تیل کی کپی چولہے کے عین اوپر بنے کارنس پر رکھتے رکھتے تیل گرا بیٹھا۔ اپنے رنگ روغن کے کام کو سمیٹ کر وہ احتیاطاً" تیل کو بچوں کی پہنچ سے دور رکھنے آیا تھا۔ کپی کارنس پر ہی پڑی لڑھکتی رہی اور اس کا تیل تل کی طرح گرتا رہا۔

اس کی چیخوں سے اماں باؤلی ہو گئی۔ دونوں انہیں ہوش نہیں آیا۔ سفینہ جل گئی۔ سفینہ جل گئی۔ اس کی پلکیں اور بھنویں بھی جل گئی تھیں۔

جل تو ارمان بھی گئے تھے سارے کے سارے' بچپن کے محبت کے۔ وعدوں کے۔ سب کے سب۔

پنچایتیں اکٹھا کی گئیں۔ منتیں کی گئیں' واسطے دیے گئے' رشتے داری' خونی رشتے یاد دلائے گئے' خدا خوفی' دریا دلی' اچھے۔ نیکی محبت۔ سب یاد دلائے گئے پر تایا نہ مانے۔

خاندان کے بڑوں نے کیا کیا نہیں کیا لیکن کوئی بھی نہیں مانا' اس کا ادھ جلا پن ہی تھا جو ہر بازی مات کر رہا تھا۔

"اس کی تو کوئی دمڑی بھی نہیں دے گا۔ میں اپنا ہیرے جیسا بیٹا کیسے دے دوں؟" تائی نے بھری پنچایت میں چمک چمک کر کہا۔

"نہ ہم راضی نہ ہمارا بیٹا۔"

سننے والوں نے یہ جملہ اتنی بار دہرایا کہ وہ سفینہ سے دمڑی ہو گئی۔ اس کی ماں نے بھی سینے پر ہاتھ مار مار کر کہا۔

"نی دمڑیے! تیرا ککھ نہیں رہیا۔"

تازہ زخموں سے اس کا منہ' آدھا سر' گردن اور سینے کا کچھ حصہ جھلا پڑا تھا۔ وہ خود کو شیشے میں اپنی نظروں سے نہیں دیکھ سکتی تھی تو یوسف کی نظروں سے کیسے دیکھتی۔ اس نے یوسف کو ہزار بہانے بنا کر بلایا' اپنی بھابھیوں کو بار بار بھیجا۔ وہ ہر بار اپنی مایوس شکل لیے کر آ جاتیں' روتیں اور اسے سمجھاتیں کہ یوسف کبھی نہیں آئے گا۔

لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ یہ سب تائی کی وجہ سے ہو رہا ہے' یوسف کی وجہ سے نہیں۔

یوسف کو بچپن سے جانتی ہے۔ وہ تو اس کے مذاق سے تنگ پڑ کر بھی جلتا کوئلہ ہاتھ میں پکڑ لیتا تھا ورنہ یوسف ایسا نہیں ہے۔

اسے اپنے جلے ہوئے حسن کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی بے شک وہ ساری کی ساری جل جاتی۔ بس اسے حسن کے گہنا جانے پر افسوس تھا۔ سب کچھ جل جاتا مگر محبت کیسے جلتی۔

"سفینہ ہے ناں تو؟" یوسف نے دیر تک گھورتے رہنے کے بعد پوچھا۔ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اگر محبت کا تعلق عمر' وقت' زمانے یا حالات سے ہوتا تو اس کا دل یوں نہ دھڑک رہا ہوتا۔

وہی پرانی لے۔ وہی سُر تال۔

وہ شہر علاج کے لیے گئی تھی' جب تائی نے جھٹ پٹ یوسف کی شادی کر کے اسے واپس مستقل روانہ کر دیا۔ دونوں بھائی بہانے سے اسے شہر لے گئے۔ اس کی اماں چند مہینوں میں ہی غش کھا کھا کر مر گئی اس کے اپنی اتنا بڑا دل نہیں تھا کہ وہ روتی بلکتی سفینہ کو آنکھ بھر کر دیکھتی۔

"بڑی عجیب عجیب باتیں سنی ہیں تیرے بارے میں۔" وہ بھی آنکھیں پھیلا کر اور بھی سکیڑ کر اس کے جلے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے سیدھا کھڑا تھا ڈھلتی عمر میں بھی شہزادہ لگ رہا تھا۔ ویسا ہی جوان اور خوب صورت۔ وہی روشن اور چمک دار آنکھیں۔

"سنا ہے تیری زبان انگارہ بن چکی ہے۔ لعنتی اور منحوس۔ تیری شکل سے بھی زیادہ کریہہ اور غلیظ۔ ایک یہی کمی تھی تو قسمت کی طرف سے پھٹکاری گئی ہے۔"

اس کی آواز میں ان سب سے زیادہ رعونت تھی جو اس کی زبان کا شکار ہوئے تھے۔ شاید وہ ان سب کا بدلہ لینے آیا۔

ہاتھ مار کر اس نے قمیص کا دامن جھاڑا اور کوٹ کو ایسے کھینچا جیسے کسی کو ہاتھ سے اشارہ دیا ہو کہ چل جا دفعان ہو۔

سفینہ کے اندر ابلتی ساری کی ساری سسکیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔

"مجھے کریہہ کہہ رہے ہو۔" اس کی لرزتی آواز پاتال سے آئی۔

"کوئی نماز روزہ کرتی۔ خدا خوفی کرتی۔ تو یہ تلا۔ مگر تو نے تو دوسروں کا ناس مارنا شروع کر دیا۔"

اس کی آنکھوں سے سب ہی لوگوں کی نفرت جھلکنے لگی۔ وہی آنکھیں جو کچھ دیر پہلے روشن اور چمک دار تھیں۔

سفینہ کا باقی ماندہ وجود بھی جل کر راکھ ہو گیا۔

"تو میں نے کیا بگاڑا۔ تمہاری آہیں میں نے انہیں سنیں۔"

اس نے رعونت سے اسے گھورا۔ "تو میرا کیا بگاڑ لے گی۔ دیکھ مجھے دیکھ خدا کا کتنا کرم ہے مجھ پر۔ شکر اس کی ذات پاک کا۔" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر عقیدت سے کہا اور پھر کوٹ کو نیچے کھینچا۔

"چودھویں کا چاند ہے میری بیوی۔ مجھے تو کسی کی سزا ملی ہے۔"

اس کی نگاہوں میں سبز سوٹ والی سما گئی جس میں سفینہ کا حسن جھلک رہا تھا اور یوسف کی محبت۔

"تم سے محبت کی سزا ملی ہے۔" تو کسی طرح آخری بددعا جیسے اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

یوسف کی شکل ایسے بگڑی جیسے الٹی کرنے والا ہو۔

صبح سویرے بھابھی نے ہی اسے دیکھا۔ اپنی آواز دبائے بڑے بھائی کے ساتھ پچھلے دروازے سے چند اور لوگوں کی موجودگی میں وہ اسے لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

وہ شادی والے گھر میں دمڑی کی موت کا سوگ پھیلانا نہیں چاہتے تھے۔ جو اپنی زندگی میں ککھ تھی اس کی موت کیا ہوگی۔

کبھی زندگی میں اس نے اپنی کسی سہیلی سے کہا تھا۔

"جس پل میرے دل سے یوسف کی محبت نکلے گی اسی پل میرا دم نکل جائے گا۔"

☼